غالب دیاں غزلاں

منظوم ترجمہ : دلشاد کلانچوی

جملہ حقوق دائمی بحق مصنف محفوظ

ناشر : بشیر احمد چودھری ڈائریکٹر
مکتبہ میری لائبریری۔ لاہور ۲

طابع : مکتبہ جدید پریس لاہور

بار اوّل : ۱۹۶۹ء

غالبؔ دیاں غزلاں

منظوم ترجمہ

پروفیسر دلشاد کلانچوی

میری لائبریری — لاہور ۲

غالبؔ کی صد سالہ برسی پر میری لائبریری کی پیشکش

دیوان غالب اردو (آفسٹ طباعت) عرشی رامپوری کے تلفظ و اعراب کے مطابق مروج متن کو حسرت موہانی کے انتخاب، حنیف رامے و عبدالرحمٰن چغتائی کی تصاویر کی نشاندہی، ناقدین کی آرا کو مختلف عنوانوں کے تحت جمع کر کے بہترین لکھائی کے ساتھ

میری لائبریری میں ۲/۲۵ سفید کاغذ مجلد -/۵

مفہوم غالب : غالب کو سمجھنے کی کوشش بار بار ہو چکی، نواب احسن علی خاں آف گنج پور کی مفہوم غالب تک رسائی کو غالبؔ شناساؤں نے ایک کامیاب ترین کوشش مانا ہے۔ مقدمہ از جسٹس ایس اے رحمان، پیش لفظ از سید وزیر الحسن عابدی۔

آفسٹ طباعت میری لائبریری میں -/۹ مجلد سفید کاغذ -/۱۵

کلیات غالب فارسی (غزلیات) : سید وزیر الحسن عابدی جو غالب شناسوں کی نظر میں غالب پر استناد (اتھارٹی) ہیں۔ تاریخی تدوین کلام غالب اور تحقیقی و انتقادی اسلوب میں مرتب کیا ہے۔ یہ ایک کتاب کئی کتابوں پر مشتمل ہے کہ قارئین مرتب کی دیدہ ریزی اور ژرف نگاہی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

بڑی تقطیع ۲۰×۲۶/۸ قریباً چھ سو صفحات میری لائبریری میں -/۹ مجلد سفید کاغذ -/۲۰

انتخابِ غالب : غالب کے خود نوشت سوانح، مع قلمی تصویر

لائق تحفہ۔ عمدہ کاغذ۔ عکسی بلاک طباعت -/۵۰

غالب دیاں غزلاں : اردو کلام کا منظوم پنجابی ترجمہ مع متن، جناب شہاب دہلوی کے مقدمہ کے ساتھ۔ مترجم پرنسپل دلشاد کلانچوی، آفسٹ طباعت بہترین کتابت میری لائبریری میں ۱/۷۵ سفید کاغذ -/۳

اپنی مادرِ مرحُومہ کے نام

جن کے طفیل سرائیکی بہاولپوری میری مادری زبان ٹھہری

ترتیب

مقدمہ ، ۹
پیش لفظ ، ۱۵
اشارات خواندگی ، ۲۱
۱- نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا ، ۲۵
۲- یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا ، ۲۷
۳- پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا ، ۳۰
۴- ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا ، ۳۳
۵- حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد ، ۳۶
۶- آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک ، ۳۹
۷- کی وفا اس نے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں ، ۴۱

۸ - حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں ، ۴۴
۹ - دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں ، ۴۷
۱۰ - دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں ، ۵۰
۱۱ - دھونا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانوٗ ، ۵۳
۱۲ - درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے ، ۵۶
۱۳ - عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی ، ۶۰
۱۴ - تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے ، ۶۳
۱۵ - دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ، ۶۵
۱۶ - پھر کچھ دل کو اک بیقراری ہے ، ۶۸
۱۷ - نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس سنائے نہ بنے ، ۷۲
۱۸ - بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے ، ۷۵
۱۹ - ابنِ مریم ہوا کرے کوئی ، ۷۹
۲۰ - بہت سی غم گیتی ، شراب کم کیا ہے ، ۸۲
۲۱ - ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے ، ۸۴
۲۲ - منظور تھی یہ شکل تجلّی کو نور کی ، ۸۷
۲۳ - غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے ، ۹۰
۲۴ - کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر ، ۹۳

مقدمہ

علاقائی زبانوں کے ادب پاروں کو پاکستان کی قومی زبان اُردو میں منتقل کرنے کی رسم تو عام ہو چکی ہے، لیکن اُردو ادب کے شہ پاروں کو کسی علاقائی زبان میں منتقل کرنے کی ابتدا، غالباً پروفیسر دلشاد کلانچوی صاحب نے کی ہے۔ یہ اقدام اس اعتبار سے نہایت مفید ہے کہ اس طرح غیر اُردو داں طبقہ کو جہاں اردو ادب کی نگارشات سے بالواسطہ مستفید ہونے کا موقع ملے گا وہاں یہ استفادہ انھیں اس بات پر اکسانے کا بھی موجب ہوگا کہ وہ بلاواسطہ اُردو ادب کے مطالعہ کی کوشش کریں۔

پروفیسر دلشاد صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو علاقائی زبانوں کی ترقی و فروغ کے زبردست حامی ہونے کے ساتھ ساتھ پاکستان کی قومی زبان اُردو کی ہمہ گیر و ہمہ رس افادیت و عظمت کے بھی قائل ہیں۔ انھیں اپنی مادری زبان بہاولپوری

ملتانی سے بے حد محبت ہے ۔ وہ اپنے علاقے کے باسیوں سے بھی بہت پیار کرتے ہیں۔ ان کے دُکھ درد کو اپنا دکھ درد اور ان کے آرام و راحت کو اپنا آرام و راحت سمجھتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ان کے ہم وطن فکر و عمل کی ان تمام نعمتوں سے مالا مال ہو جائیں جو کسی بھی خوش قسمت خطّے کے رہنے والوں کو میسر ہیں۔ وہ اپنی خوشی میں بھی اپنے ہموطنوں کو شریک کرنا چاہتے ہیں اور ان کی یہ تمنّا ہے کہ انھیں غیر زبانوں سے روحانی سکون کا جو سامان میسّر آیا ہے وہ اپنے ہموطنوں کو بھی پہنچا دیں۔ چنانچہ غالبؔ کی اُردو غزلوں کو جو فکر و فن کا اعلیٰ نمونہ ہیں اور جنھوں نے دلشاد صاحب کے شہپرِ خیال کو پرواز کی طاقت بخشی ہے۔ بہاولپوری ملتانی زبان میں منتقل کرنے کی سب سے بڑی تحریک یہی ہے کہ وہ اُردو غزل کی اعلیٰ اقدار سے ان لوگوں کو محظوظ و مستفید کرنا چاہتے ہیں جن کے لئے اُردو زبان اجنبی نہیں تو اپنے نکات و معارف کے اعتبار سے سریع الفہم بھی نہیں ہے۔

ترجمے کا فن خاصا دشوار گذار ہے اور بالخصوص جب کسی ایک زبان کے اشعار کو کسی دوسری زبان میں اشعار کی صورت میں ڈھالنا ہو تو یہ دشوار گذار راستہ اور بھی کٹھن ہو جاتا ہے۔ دراصل اس سلسلہ میں منزل رسی کی سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ مترجم بیک وقت دونوں زبانوں پر قدرت رکھتا ہو۔ یعنی اس زبان کی لطافت اور اسرار و رموز سے بھی پوری طرح آگاہ ہو جس کے اشعار کا ترجمہ کرنا اسے مقصود ہے اور وہ زبان بھی اس کے ماہرانہ تصرف کی متحمل ہو جس میں ان اشعار کا ترجمہ

کرنے کی ضرورت لاحق ہے ۔ ایک اور بات جو منظوم تراجم کی کامیابی کے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہے وہ مترجم کا اعلیٰ ذوقِ شعری ہے ۔ اگر مترجم خود اچھا شاعر نہیں یا کسی مضمونِ شعر کو قادرانہ انداز میں نظم کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں تو وہ ترجمہ کا حق ادا نہیں کر سکتا ۔

پروفیسر دلشاد کلانچوی جہاں اُردو زبان کے ایک اچھے ادیب اور شاعر ہیں وہاں ملتانی بہاولپوری زبان ان کے گھر کی لونڈی ہے ۔ وہ جس بے تکلفی کے ساتھ اپنی زبان میں شعر کہہ سکتے ہیں، اسی روانی اور آسانی کے ساتھ اپنے خیالات کو اُردو شعر کا جامہ پہنانے کی بھی ان میں پوری صلاحیت ہے ۔ یوں بھی بقول دلشاد صاحب ملتانی بہاولپوری زبان اُردو سے بہت قریب ہے ۔ عربی فارسی الفاظ کثرت سے مشترکہ طور پر دونوں زبانوں میں ملتے ہیں ۔ افعال و مصادر میں بھی کوئی زیادہ فرق نہیں ۔ بہ الفاظِ دیگر اُردو کے کسی بھی فقرے کو اگر ملتانی بہاولپوری لب لہجہ میں ادا کر دیا جائے تو وہ ملتانی بہاولپوری زبان کا فقرہ بن جاتا ہے ۔

دلشاد صاحب نے دونوں زبانوں کی اسی ہم آہنگی سے فائدہ اُٹھا کر غالب کی اُردو غزلیات کو ملتانی بہاولپوری نظم کا لباس پہنایا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک زبان دوسری زبان سے مستعمل الفاظ کے اشتراک یا کسی اور خوبی کے باعث کتنی ہی مماثلت کیوں نہ رکھتی ہو، جب تک ثقافتی اور تہذیبی

اعتبار سے ان میں ہم آہنگی اور یگانگت نہ ہو۔ ان کا باہمد گر بُعد اور فاصلہ باقی رہتا ہے۔ ویسے بھی اُردو کا اپنا مزاج ہے۔ اس کی شاعری ایک خاص تمدّن کی ترجمانی کرتی ہے۔ استعارات و تشبیہات میں بھی اگرچہ فارسی کے اثرات غالب ہیں لیکن ان میں گرد و پیش کے عوامل کو خاصا دخل ہے۔ پھر غزلیاتِ غالبؔ جو اُردو شاعری کا سب سے زیادہ گراں قدر سرمایہ ہے اور اپنی معنی آفرینی، جدّتِ فکر اور طرزِ ادا کی وجہ سے متواتر و مسلسل شارحین کا تختۂ مشق بنتا چلا آرہا ہے اور پھر بھی بقول غالبؔ ؎

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدّعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

اسے معانی و مطالب، سوز و گداز اور لطافت و نزاکت کی جملہ خوبیوں کو قائم رکھتے ہوئے، ملتانی بہاولپوری زبان میں منتقل کرنا دشوار تر ہے۔ دلشاد صاحب نے غالباً معاملے کی اسی نزاکت کے پیشِ نظر ترجمے میں یہ اہتمام کیا ہے کہ اصل غزلیات کے اوزان و بحور اور ردیف و قوافی کو جوں کا توں برقرار رکھا ہے۔ فارسی اور عربی الفاظ جو مشترکہ طور پر دونوں زبانوں میں مستعمل ہیں۔ انھیں بھی ملتانی بہاولپوری میں منتقل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ صرف اسماء، افعال اور صفات وغیرہ میں ردّ و بدل کیا ہے۔ مثلاً 'کا' کی بجائے 'دا'۔ 'کی' کی بجائے 'دی'۔ 'ہونا' کی بجائے 'ہوندا'۔

'تک' کی بجائے 'تئیں'۔ 'آگے' کی بجائے 'اگوں'۔ 'بہت' کی بجائے 'بہوں'۔ وغیرہ وغیرہ۔

ترجمے کی اس تکنیک نے نہ صرف اشعارِ غالب کی معنویت میں خلل پڑنے کے امکانات کو یکسر خارج کر دیا ہے بلکہ ترجمہ میں اصل اشعار کی حسن و خوبی بھی قائم رہی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

غالب: آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرم نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

ترجمہ: آتش پرست آہدے ہن لوکی جہان دے
آہیں تے میڈیاں زاریاں دے انگار ڈیکھتے

غالب: آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

ترجمہ: آپڑیں دل دی پریشانی انہاں کوں اج تاں
آکھدے ہیسے پر او دیکھو جو کیا آہدے ہن

غالب: ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

ترجمہ : اساں ٹھیا جو وسارا نہ کریسیں ول وی
ڈھوڑھتی ویسوں اساں تیکوں خبر ہوونڑ تئیں

غالب : کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ترجمہ : آکھاں میں تاں کیکوں آکھاں ڈکھی رات ہک بلا ہے
نہ مرنڑ میکوں برا ہا جو ایہ ہکی وار ہوندا

تراجم میں اگرچہ غالب کا لب و لہجہ قائم نہیں رہا لیکن بہاولپوری ملتانی شاعری کا آہنگ اس خوبصورتی سے استوار ہو گیا ہے کہ بعض جگہ ان پر اصلیت کا دھوکہ ہوتا ہے اور پڑھنے والا اشعار کی داخلی کیفیات و حسیات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے امید ہے کہ یہ منظوم تراجم مقبول ہوں گے اور دلشاد صاحب غالب کی بقیہ غزلوں کو بھی ملتانی بہاولپوری کا جامہ پہنا کر اس علاقے کے رہنے والوں کے لئے مزید دلچسپی اور استفادے کا سامان فراہم کریں گے ۔

مسعود حسن شہاب
بہاولپور۔
۱۰ - ۸ - ۶۷

پیش لفظ

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ کسی زبان کے شعر کو نثر میں ڈھالنے سے اس کی روح کافی حد تک مجروح ہو جاتی ہے۔ خصوصاً نثری قالب میں آجانے پر اس کا جمالیاتی تاثر تو بالکل ختم ہو کے رہ جاتا ہے کیونکہ نثری لبادے میں اس کے اوزان و اراکین کی گھن گرج دب جاتی ہے، اس کے الفاظ و تراکیب کا بناؤ سنگھار بگڑ جاتا ہے اور اس کی علامات و کیفیات کا رکھ رکھاؤ قائم نہیں رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے مفاہیم و مطالب کا جوش و خروش بھی دھیما پڑ جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ آسمان سے کسی ستارہ کو اتار کر زمین پر رکھ دیا گیا ہے۔ ویسے بھی آسمانِ شعر اور زمینِ نثر کا فرق کسے نظر نہیں آتا۔

چنانچہ کچھ یہی سبب ہے کہ شعری روح و جمال کے تحفظ کے طور پر ایک زبان کے شعر کو دوسری زبان کے شعر میں ہی ڈھالنے پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔